میجر (ر) غلام نبی اعوان

مرزا غالبؔ اور عصرِ جدید

مرزا غالبؔ کی شاعری کے فنی و فکری پہلوؤں کو اتنا کھنگالا اور رونداگیا ہے کہ شاید مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ غالبؔ روایت شکن، غالبؔ اسلوب گر، غالبؔ جدت پرست، غالبؔ امامِ جدت۔ تنقید کے علاوہ لسانی نقطۂ نظر سے بھی غالبؔ کی تحریروں کے کسی پہلو کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا گیا۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے لائبریریاں اٹی پڑی ہیں۔ یوں تو ہزاروں اشعار غالبؔ کے نمائندہ اشعار کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن میرے پیشِ نظر غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر رہے ہیں۔ یہ اشعار مجھے ہمیشہ سے متاثر کرتے رہے ہیں:

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

Scanned by CamScanner

اس میں شک نہیں کہ ہمارے نقادوں نے سماجی اور معاشرتی حوالے سے ان موضوعات پر عظیم کتابیں رقم کر ڈالی ہیں جن کے امتزاج سے غالبؔ کی فنی شخصیت کا خمیر گوندھا گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ غالبؔ کے شاعرانہ کمال کا ایک پہلو ابھی تک ایسا ہے، جس پر جتنا بھی لکھا جائے، کم ہے۔ اس پہلو پر جتنی دفعہ میں نے غور کیا، اتنی دفعہ مجھے ایک نئی صورت حال سے واسطہ پڑا۔ یہ پہلو ہے مرزا غالبؔ کی وہ فکری بازگشت جو تقریباً ڈیڑھ صدی گزرنے کے باوجود آج بھی نہ صرف توانا ہے بلکہ آج بھی ہمارے معاشرتی تانوں بانوں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ آج بھی غالبؔ میرا ہمعصر ہے اور آج بھی اس کی سوچیں میرے معاشرے کے ہر حساس شخص کی سوچوں جیسی ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ اس کے اندر میرے معاشرے کا "اینگری ینگ مین" حلول کر گیا ہے۔ وہی شکست و ریخت اور معاشرے کا زوال، جو ڈیڑھ صدی پہلے غالبؔ اور اس کے ہم عصر لوگوں کا مقدر تھا، آج بھی پوری شدت کے ساتھ لوگوں کی قسمتوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

شاعر کو پیش گو کہا جاتا ہے۔ وہ آنے والے وقت کے کچھ دھندلکے کسی نہ کسی رنگ میں اشارۃً، علامتاً یا کنایتاً اپنے اشعار میں دکھا جاتا ہے۔ جب اس کا دور لد جاتا ہے تو بھی اس کی آواز کا اثر قائم رہتا ہے۔ شاعر کی فنی آنکھ جاگ رہی ہوتی ہے۔ اس خصوصیت کی توضیح صرف اس حد تک کی جا سکتی ہے کہ شاعر ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس کی قوتِ مشاہدہ اور متخیلہ دوسرے افراد سے فزوں تر ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ کیمرے کی آنکھ ہوتی ہے جو ہر منظر کو شعر کے روپ میں منعکس اور منعطف کرتی چلی جاتی ہے۔ جب ایک اچھا شاعر اپنی زندگی کا سفر تمام کر لیتا ہے تو اس کی آواز کی بازگشت آنے والے زمانے میں بھی سنائی دیتی ہے۔ اس بازگشت کا عرصۂ حیات کتنا ہے اور وہ کب تک اپنے پڑھنے والوں کو متاثر (Haunt) کرتی رہتی ہے؟ یہ ہے وہ اصلی پیمانہ جو نقاد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ معاشرہ سرعت سے تغیر پذیر ہے جبکہ

Scanned by CamScanner

آنکھ بند ہوتے ہی شاعر کے مشاہدات تھم جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات طے ہے کہ شاعر کے مقدور بھر اک مخصوص مدت تک تو اس کی آواز مؤثر رہتی ہے اور معاشرے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ پھر یہ آواز تھک ہار کر کہیں پیچھے رہ کر تحلیل ہو جاتی ہے اور تغیر پذیر معاشرہ آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن غالبؔ کا اک بڑا کمال یہ ہے کہ ڈیڑھ صدی گزرنے کے باوجود اپنی فکر کے صدقے وہ اپنے شعروں میں آج بھی ہمارے دور میں سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی آواز بڑی توانا اور تروتازہ لگتی ہے۔ غالبؔ کا فکری کمال یہ ہے کہ اپنی تخلیقات میں اس نے جن سماجی رویوں اور معاشرتی ناآسودگیوں کے پیکر تراشے ہیں، وہ ہمارے آج کے معاشرے کی تصویریں ہیں۔ غالبؔ کو اسی نفسیاتی مہارت نے ہمارے دور میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگرچہ غالبؔ کی شخصیت دو واضح حصوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن شخصیت کی اسی دو رنگی نے اسے ہمارے برگشتہ نوجوان کے شانہ بشانہ ایستادہ کر دیا ہے۔ مرزا غالبؔ نے برصغیر پاک و ہند کے اس سیاسی دور میں آنکھ کھولی جب ایک صدیوں پرانی تہذیب آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی اور سات سمندر پار سے آنے والی گوری تہذیب پرانی تہذیب پر تیزی سے چھاتی جا رہی تھی۔ ایک نظام ختم ہو رہا تھا اور دوسرا اجنبی نظام جنم لے رہا تھا۔ لے دے کے اک قلعہ معلیٰ باقی رہ گیا تھا جو تاریخ کے گزرے لمحات کی کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ ادبی فکر وخیال نے بدلتے حالات میں ابلاغ و اظہار کے نئے زاویے ابھی تلاش نہیں کیے تھے۔ ادب دبے پاؤں آنے والی تبدیلی سے بے خبر اپنی روا میں منہ ڈھانپ کے سویا ہوا تھا۔ لکھنا پڑھنا ہنوز ''شغلِ شاہاں و کارِ بیکاراں'' تک محدود تھا۔ شاعری میں داخلیت گھسی ہوئی تھی اور نثر قصوں کہانیوں اور داستانوں کے لیے مختص تھی۔ اس ماحول میں اگر آپ غالبؔ کو Place کرنے کی کوشش کریں تو خدا لگتی کہیے کہ وہ وہاں Alien نہیں محسوس ہوتا؟ یقیناً محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں ذوقؔ اور غالبؔ کی مغلیہ دربار میں معاصرانہ چشمک نے ادب کو ایک نئی راہ پر ڈالا۔ اس کا عمل اور ردِعمل ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ ورنہ روایت شکنی میں غالبؔ کی شعوری کوششوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اس نفسیاتی نکتے نے

Scanned by CamScanner

غالب کو انانیت، روایت شکنی اور ادبی جاہ و جلال کی خصوصیات سے نوازا۔ اگر بہادر شاہ ظفر کے دربار میں غالب کو وہ مقام مل جاتا جس کا وہ متمنی تھا تو شاید غالب بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح کتابوں میں بند ہو کر لائبریریوں کی سیلن زدہ الماریوں میں بند سو رہا ہوتا۔ مگر دیکھ لیں کہ اپنے فکری نظام کی بدولت آج چار دانگِ عالم میں غالب غالب ہو رہا ہے اور ہر زبان میں اس کے نام کی مالا جپی جا رہی ہے۔

دربار میں متوقع پذیرائی نہ ملنے کا ردِعمل غالب پر بہت گہرا مرتب ہوا۔ اس کی شاعری پر سرکشی اور کھینچا تانی کا عنصر کچھ اس طرح سے حاوی ہوا کہ اس نے شعر کے فکری نظام کی پوری کلاسیک کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ حضرتِ خضر پر شک و شبہ کی نظر ڈالنے لگا۔ فرشتوں کا لکھا اس کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہرا۔ اس نے محبوب کے دروازے پر پتھر بن کر پڑے رہنے کی بجائے اس کے دامن کو حریفانہ کھینچ کر اس کے ہزاروں سال پر محیط بت کو چوراہے پر لا پھینکا۔ اس کے ہاں ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اس کا دَم نکلتا تھا۔ ناآسودہ معاشرت نے اسے صحیح اور جائز مقام نہیں دیا تھا۔ وہ دربار سے منسلک ہونے کے باوجود ذوق سا مرتبہ حاصل نہ کر سکا۔ اس ناقدری کے غالب پر منفی اثرات شدت سے مرتب ہوئے۔ چنانچہ جب غالب کا فن اس ناآسودہ کٹھالی سے گزرا تو اس پر سرکشی، بغاوت، انانیت، انتقام اور تشکیک کے چوکھے رنگ چڑھ گئے۔ اس شریف آدمی کی طرح جو ناکردہ گناہ کی سزا بھگت کر جب جیل سے نکلتا ہے تو اس کی دنیا بدل جاتی ہے اور وہ معاشرے سے انتقام لینے پر تُل جاتا ہے۔ جن عناصر سے غالب کی شاعری کا ظہورِ ترتیب ہوتا ہے وہ آج بھی ہمارے معاشرے کی جواں نسل کا نفسیاتی المیہ ہے۔ ناآسودہ خواہشات، تشنہ کام آرزوئیں، بے روزگاری، معاشرتی ناہمواری اور سماجی ناانصافی ایسی وراثتی لعنتیں ہیں جو آج بھی ہمیں دامن گیر ہیں۔ معاشرے میں پلنے والی ان بیماریوں کے مضر اثرات نے ہر ذہن کو آکاس بیل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ وہ اذہان جنہوں نے اپنے تصورات کے محل غالب کی طرح اجڑتے دیکھے، غالب ان کا

Scanned by CamScanner

مونس و غمخوار ہے۔ غالبؔ ان کا ہم راز اور شریکِ غم ہے۔ کیونکہ غالبؔ اور آج کے حساس جوان کی نفسیاتی الجھنیں ایک سی ہیں۔ غالبؔ کی شاعری میں پیچیدگی و پرکاری اور شوکتِ لفظی کا جو ایک واضح عنصر موجود ہے، دراصل یہ بھی سماجی گھٹن کا نفسیاتی ردِعمل ہے۔ غالبؔ نے معاشرے کے اونچے مقام تک پہنچنے کے لیے ادب کو ذریعہ بنانا چاہا کیونکہ تنزل پذیر معاشرے میں اپنی خاندانی عظمت و رفعت کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر اسے کما حقہٗ پذیرائی نہ ملی اور وہ ذوقؔ سے پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اس ناکامی کا اس کے محسوسات پہ شدید ردِعمل مرتب ہوا۔ خود کو غلافوں میں چھپانے کی ایک کیفیت اس پر وارد ہونے لگی۔ یہ غالبؔ کی ایک شعوری کوشش تھی۔ اگرچہ وہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا مگر خاندانی وضع داری کے بھرم نے اشعار میں شوکت وسطوت کی راہ پالی۔ ذوقؔ اس کے مقابلے میں فکری اعتبار سے کہیں کم تر تھا مگر آسودہ حال تھا اور معاشرے میں مقام رکھتا تھا۔ آج کا حسّاس نوجوان جب اپنی آدرش اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھتا ہے تو بالکل پس جاتا ہے، بجھ جاتا ہے۔ پھر وہ معاشرے سے انتقام کے راستے تلاش کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان جب بغاوت پر آ جائے تو اس کے اقدامات بڑے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب غالبؔ کی آرزوئیں دم توڑ گئیں تو غالبؔ نے اپنے فیلڈ میں وہ اقدامات کیے جو آگے چل کر اس کی لازوال شہرت کا سبب بنے۔ اپنے وقت کے معاشرتی و سماجی مسائل اور ان کے نفسیاتی ردِعمل نے غالبؔ کو ادب کی وہ متاعِ عزیز عطا کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے اوراق میں اتر گیا۔ اگر غالبؔ کو اس کی نجی زندگی کے حوالے سے پڑھا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور نفسیات کی گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

غالبؔ کے وہ خطوط لیجیے جو اس نے ذاتی طور پر اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس کے یہ خطوط کسی وقت میں دنیائے ادب کا سرمایہ بنیں گے اور ان کو خوب اچھالا جائے گا تو شاید اپنے اشعار کی طرح وہ اپنی نثر پر بھی کئی غلاف

Scanned by CamScanner

بڑھا دیتا۔ غالبؔ کے نثر پاروں کی روشنی میں اس کی شعری نفسیات کو سمجھنے کا بہتر موقع ملتا ہے۔ غالبؔ جونہی شعر سے نثر کی طرف سفر کرتا ہے، اس کا لہجہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اپنی نثری تحریروں میں غالبؔ نے مروجہ سماجی نظام کے تہ در تہ مسائل کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ بے یقینی کی کیفیت اور سیاسی و سماجی ناہمواریوں کی صورتِ حال کبھی ہمیں غالبؔ کے دور میں کھینچ کے لے جاتی ہے تو کبھی غالبؔ کو کھینچ کر ہمارے دور میں لا بساتی ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیاں جو اس وقت رائج تھیں، آج بھی موجود ہیں۔ معاشرے کی شکست و ریخت اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں جن رویوں کو غالبؔ نے تشکیک کی نظر سے دیکھا، وہ رویے آج بھی کارفرما ہیں۔ اگرچہ جدید شاعر یا ادیب بھی ان رویوں کا شاکی ہے، مگر وہ تشکیک جو غالبؔ کی طبیعت کا حصہ ہے اس کی جھلک ان جدید شاعروں میں کم کم ملتی ہے۔ چنانچہ جلا بھنا ہوا اور معاشرے کا روندا ہوا نوجوان مرزا غالبؔ کو زیادہ اپنے قریب پاتا ہے۔

•••○•○•••

Scanned by CamScanner